اسلامی ریاست کا تصور اور ضرورت

ڈاکٹر سجاد علی*

sajjad04ali@yahoo.com

کلیدی کلمات: اسلامی ریاست، اسلام، بادشاہت، جمہوریت، الہی حکومت۔

خلاصہ

کئی عرصے سے ہمارے دانشوروں اور علماکے مابین اسلامی ریاست، اس کی ضرورت اور اس کی خصوصیات پر تحقیق و بحث جاری ہے۔ اسلامی ریاست کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جہاں مسلم آبادی زیادہ ہوگی وہی اسلامی ریاست ہے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جس مملکت کے قوانین سلطانیہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر بنائے گئے ہوں یعنی قرآن و سنت کو ان قوانین میں مرکزیت حاصل ہو۔ لہٰذا اگر ریاست کی بنیاد سوشلزم، لبرل ازم وغیرہ جیسے نظریات پر رکھی گئی ہو تو ایسی ریاست اسلامی نہیں کہلائے گی نیز چونکہ حکومت ریاست کا ایک عنصر ہے اس لئے جب حکومت اور ریاست مذہب کے تابع ہوں تو اس کو اسلامی ریاست کہا جاسکے گا۔ اس ضمن میں اسلامی طرز حکومت، بادشاہت اور جمہوریت میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ اسلامی طرز حکومت نہ ہی بادشاہت ہے اور نہ ہی مغرب کی رائج کردہ جمہوریت ہے، بلکہ یہ الٰہی حکومت ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اسلامی ریاست کے مفہوم اور اس کے دیگر سیاسی نظاموں سے فرق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقدمہ

یہ ہمیشہ سے موضوع سخن رہا ہے کہ اسلامی ریاست کیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں اور کس لئے ہے۔ تاریخ اسلام میں جتنی بھی اسلامی ریاستیں معرض وجود میں آئیں ان ریاستوں کے خدوخال اور کردار کے پیش نظر اسلامی ریاست کی ضرورت کا نظریہ تقریباً ماند پڑ گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف آج کی مسلم دنیا میں متعدد ایسی ریاستیں موجود ہیں، جہاں پر ریاست کو مذہب کا تابع بنایا گیا ہے، یہاں تک کہ چار ریاستوں کے سرکاری نام میں لفظ "اسلامی" کا استعمال اسی بات کو ثابت کرتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان، اسلامی جمہوریہ ایران، اسلامی جمہوریہ افغانستان، اسلامی ریپبلک آف موریطانیہ۔

قبل اس کے کہ اسلامی ریاست کی ماہیت پر گفتگو کی جائے، اس بات کا تجزیہ لازم ہے کہ کیا اسلام کسی طرح کا نظام زندگی رکھتا ہے؟ یا اسلام محض چند منتشر خیالات اور نظریات کا نام ہے، جس کو اسلام سے وابستہ لوگوں نے اپنی برتری جتانے کے لئے پیش کیا ہے یا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مسلمانوں نے دیگر نظام ہائے زندگی کا مقابلہ کرنے کی غرض سے چند منتشر نظریات کو منظم کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو؟ یہ میرا محض ایک خیال نہیں ہے، بلکہ بعض مسلمان اور غیر مسلم دانشوروں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کے پاس اپنا کوئی سیاسی نظام نہیں ہے بلکہ اسلام محض ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کی صرف اخلاقی تربیت کرتا ہے یا ایک فرد کی تربیت اس نہج پر کرتا ہے کہ کمال اور سعادت حاصل کرے۔

---

*۔ٹیچنگ ایسوسی ایٹ شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی

اسلام معاشرہ کی فلاح و بہبود اور اس کے ارتقاء کے لئے کوئی منظّم نظام مہیا نہیں کرتا یعنی اسلام سرے سے کوئی سیاسی اور تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا۔ انسان کو دنیاوی زندگی استوار کرنے کے لئے خود کوئی سیاسی نظام وضع کرنا ہوگا یا کسی دنیاوی وضع کردہ سیاسی نظام سے خود کو وابسطہ کرنا ہوگا۔اسی لئے اسلام کے متعلق اس طرح کے فقرے اکثر سامنے آتے ہیں کہ " اسلام ایک جمہوری نظام ہے۔ اسلام آمریت کا حامی مذہب ہے یا اسلام سوشلزم کا علمبردار ہے"اس طرح کا دعویٰ کرنے والوں نے دین کا باقاعدہ مطالعہ کرکے اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ دین کا نظام حیات کیا ہے اور اس میں ریاست کا کیا مقام ہے اور ریاست کو چلانے کے لئے اسلام نے کون سے اصول فراہم کئے ہیں۔ اس طرح کے دعوے کرنے والوں نے اسلامی نظریہ حیات کے چند ظاہری اصولوں کو دیکھ کر اس پر آمریت، جمہوریت اور سوشلزم ہونے کے الزامات لگائے ہیں۔

اسلامی نظام حیات کو مکمل اور جامع تسلیم نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بنی ہے کہ کچھ اسکالرز نے یہ تصور کیا ہوا ہے کہ جو چیزیں دنیا کے دیگر نظام ہائے زندگی میں مقبول ہیں وہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جب دنیا میں "نظام اشتراکیت" مشہور ہوا تو بعض محققین نے کہا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک نیا ایڈیشن ہے۔ جب بادشاہت کا دور آیا تو اطاعت امیر کا نعرہ بلند ہوا اور اسی طرح آج دنیا میں مختلف نظام ہائے زندگی رائج ہیں، تو بہت سے محققین، اسلام کے نظریۂ حیات کو ان نظام ہائے زندگی سے منسوب کرتے ہیں اور ان میں سے جو جس کو بہتر نظام زندگی تصور کرتا ہے اور ایک کامیاب نظام سمجھتا ہے اسی کو اسلامی نظریہ حیات میں تلاش کرنا شروع کردیتا ہے اور اس کی توجیہہ قرآن اور حدیث سے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری نظر میں یہ ایک غلط تصور ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ علمی طریقہ سے اس پر تحقیق کی جائے کہ درحقیقت اسلام کا نظریہ نظام حیات کیا ہے؟

اسلام کے نظریہ نظام حیات پر بحث کرنے سے پہلے یہ بتانا لازمی ہے کہ کیا اسلام نے خود بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کے پاس ایک مکمل نظام حیات ہے۔ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں اعلان ہوا ہے کہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔" (1) (ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) اس آیت میں ایمان والوں سے کہا جارہا ہے کہ اسلام کو مکمل طور پر اپناؤ۔ اگر اسلام نے فرد کے علاوہ معاشرہ کی تعلیم و تربیت اور اس کو صحیح راہ پر استوار کرنے کا نظام نہ دیا ہوتا تو کبھی وہ فرد کو اپنی پوری زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کو اپنانے کا حکم نہیں دیتا۔ یاد رہے کہ اسلام انسان کو اپنی زندگی کی تمام جہتوں کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام جہاں ایک فرد کو رہنمائی اور ہدایت دیتا ہے کہ وہ سعادت مند ہو جائے وہیں پر وہ معاشرہ کی سعادت مندی کا بھی متمنی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر زاہد علی زاہدی تحریر کرتے ہیں:

> "اسلام نہ صرف یہ کہ ایک فرد کی اس نہج پر تربیت کرنا چاہتا ہے کہ وہ کمال اور سعادت حاصل کرسکے، بلکہ اسلام ایک ایسے معاشرہ کی بھی تشکیل چاہتا ہے جس میں افراد معاشرہ کی تربیت کے بھرپور مواقع ہوں اور شر کی قوتوں کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ گویا اسلام خدا اور بندہ کے درمیان روحانی روابط سے آگے بڑھ کر معاشرے کی باگ ڈور بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری سے آراستہ ہوں تاکہ ایک عادلانہ معاشرہ کی بنیاد استوار ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مفکرین کے ایک گروہ کے بقول اسلام اپنے نظام حیات کو معاشرے میں نافذ کرنے کے لئے طاقت کے حصول کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔" (2)

لہٰذا سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور اصولوں کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔ کوئی بھی فرد اور معاشرہ اس وقت تک سعادت مند اور صالح نہیں بن سکتا ہے جب تک انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اسلام کی مکمل اطاعت نہیں کی جاتی۔

اسلامی نظریۂ حیات کی جامعیت کو کم کرنے کی ایک اہم وجہ دین اور دنیا کی تقسیم بھی بنی ۔ بعض قدیم اور جدید مفکرین نے دین کو دنیا سے الگ تصور کیا۔بنیادی طور پر دین کو دنیا سے الگ تصور کرنا ایک سیکولر فکر ہے۔ سیکولر افراد سیاست کو دین سے الگ اور سیاسی اور ریاستی امور میں دین کی حاکمیت کی نفی کرتے ہیں۔ دنیا کو دینی معاملات سے الگ تصور کرنے کی تاریخ قدیم ہے۔ یہ ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہے کہ اس پر عمیق تحقیق کی جائے البتہ اتنا کہنا کافی ہے کہ کلیسا اور ریاست کی تقسیم کی یہ فکر بنیادی طور پر عیسائیت کی تبلیغات کا حصہ رہی ہے۔ جیسے احمد واعظی رقم طراز ہیں:

"سیکولرازم اور لائیک نے ایک نئی فکری شکل اختیار کرلی اور سیکولرازم نے کائنات اور انسان کو ایک نیا نظریہ دیا۔ یہ نظریہ بہت سے موارد میں دین کی حاکمیت اور اس کی تعلیمات کی قدر و قیمت کا منکر ہے۔ سیکولر حضرات ابتدا میں علم اور ایمان کی علیحدگی پر اصرار کرتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے تمام انسانی علوم حتیٰ کہ فلسفہ اور ماورائے طبیعت موضوعات کو بھی دینی حاکمیت اور دینی تعلیمات کے دائرے سے خارج کر دیا۔ البتہ ان لوگوں کی یہ حرکت اور فکر کلیسا کی سخت گیری کا نتیجہ اور ردعمل تھا کہ جنھوں نے علم و معرفت کو عیسائیوں کی مقدس کتب کی خود ساختہ تفسیروں میں محدود کر دیا تھا اور دانشوروں کی تحقیقات اور علمی رائے کی آزادی کو سلب کر لیا تھا۔ مسیحی کلیساؤں نے قرون وسطیٰ کے تمام علمی، ادبی اور ثقافتی شعبوں میں مقدس کتب پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی تھی۔ اس وجہ سے سیکولر حضرات ردعمل کے طور پر "سیکولر علوم اور وہ علوم جو دین اور کلیسا کی دسترس سے خارج تھے" کے دفاع کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔" (3)

کسی بھی قاری کے اس وقت تک اسلام کے نظریہ حیات کی جامعیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں جب تک اسے مذکورہ بالا تقسیم کے بے معنی ہونے کا احساس نہ ہو اور یہ قبول نہ کرے کہ اسلام روح اور نفس کے مجموعہ کا نام ہے، جب فرد اپنا رابطہ خدا سے باندھے تو اسے روح کہا جاتا ہے اور پھر روح کی پاکیزگی کے لئے اسے اپنے نفس کو دنیا سے معلق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ خالق کی پہچان مخلوق کے وجود سے ہوتی ہے۔ مخلوق اپنی وجودی حیثیت میں مادّہ ہے اور جوہری حیثیت میں روح۔ انسان من حیث المخلوق مادّہ کا محتاج ہے تو یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ روح کی پاکیزگی بغیر مادہ کے ہو جائے۔ لہٰذا خالق کی پہچان کے لئے انسان کو دونوں سے وابستگی لازمی ہے۔ معروف مصری عالم یوسف قرضاوی رقم طراز ہیں:

"اسلام میں سرے سے انسانی زندگی کے معاملات کی یہ تقسیم ہی نہیں کہ زندگی کے یہ امور دینی ہیں اور یہ غیر دینی۔ دین و دنیا کی تقسیم ہی غیر اسلامی اور مسیحی مغرب سے درآمد شدہ ہے اور جو ہمارے معاشرے میں بعض اداروں اور لوگوں کے بارے میں دینی اور غیر دینی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس تقسیم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ اسلام میں آخری دور تک تقسیم وجود میں نہیں آئی تھی کہ تعلیم کے ایک حصہ کو دینی تعلیم کہا جائے اور اس کے دوسرے حصے کو غیر دینی یا غیر مذہبی کہا جائے۔ کچھ ایسے افراد ہوں جنہیں مذہبی لوگ یا رجال دین کہا جائے اور دوسرے لوگ رجال علم، اہل سیاست اور اہل علم کہلائیں۔ اسلامی نظام حیات میں زندگی کے یہ دو حصے کبھی نہیں رہے اور دین و دنیا کی تفریق کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اسلام اس دین سے آشنا نہیں جو سیاست سے عاری ہو اور اس سیاست کو تسلیم نہیں کرتا جو دین سے خالی ہو۔ اسلام میں زندگی کے تمام پہلو اس طرح باہم مربوط اور دوش بدوش رہے ہیں جس طرح جسم و جان کا رشتہ باہم مربوط ہے۔ اسلام کی نظر میں روح کوئی جدا اور علیحدہ شئے ہے اور نہ جسم روح سے بے گانہ ہو کر کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ اس لئے اسلام کی نظر میں دین اور علم، دین اور دنیا اور دین اور حکومت کا رشتہ مربوط، غیر منفصل اور کبھی جدا نہ ہونے والا ہے۔" (4)

اسلام میں مطلقاً ترکِ دنیا کی اجازت نہیں اور نہ ہی تخلیق انسانی کا اصل مقصد صرف دنیا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں دین کی اہمیت کے پیش نظر اکثر دنیا کی مذمت کی گئی ہے، دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کا تذکرہ اسلامی تعلیمات میں بہت زیادہ ملتا ہے، جس کی وجہ سے طول تاریخ میں مسلمانوں کے درمیان ترک دنیا کے نظریات وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں، آج بھی بعض مسلمان متعدد صوفیاء کرام سے منسوب ترک دنیا کی بے شمار عملی صورتیں پیش کرتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی اور عارضی ہونے میں دو رائے نہیں اور نہ ہی دنیا کی بے ثباتی ہونے کا نظریہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، بلکہ ہمارے نزدیک لذات دنیا کو ترک کرنے کا نظریہ اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی پر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے تقریباً نو (۹) خطبات (خطبہ نمبر ۳۲، ۵۲، ۶۱، ۶۲، ۸۰، ۸۷، ۹۷، ۱۰۹، ۱۱۱) نہج البلاغہ میں موجود ہیں۔ ان خطبات کو سطحی انداز میں دیکھیں تو یہی تاثر ملتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے مطلقاً ترک دنیا کا درس دیا ہے، لیکن دوسری طرف آپ کے بہت سے ایسے فرامین بھی ملتے ہیں جس میں دنیا اور اس میں موجود ان گنت مظاہر قدرت پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اس جملے پر غور کریں "اَلاَ وَاِنَّ الدُّنیا دَارٌ لَایُسْلَمُ مِنْھا اِلَّا فیھا" تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا ایسا گھر ہے کہ اس کے (عواقب) سے بچاؤ کا ساز و سامان اسی میں رہ کر کیا جاسکتا ہے۔ (5)

لہٰذا کلیسا کے دعویٰ کے مطابق روح کی پاکیزگی کے لئے لذات دنیا سے اپنے کو الگ کرنا ضروری ہے تو دوسری طرف نظریہ سیکولرازم کے مطابق خدا کی پہچان کے لئے ترکِ مذہب لازمی ہے۔ ہماری نظر میں یہ دونوں نظریات فاسد ہیں۔ علامہ اقبال مغربی و مشرقی دونوں علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ نے مذہب اور دین کی اس تقسیم کو بہت ہی خوب انداز میں یوں پیش کیا ہے:

> "اسلام میں روحانی اور وقتی دو الگ الگ عالم موجود ہی نہیں اور کسی بھی فعل کا کردار خواہ غیر مذہبی ہی کیوں نہ ہو، وہ ذہنی رویے کی کارفرمائی ہے، جو صاحب عمل تشکیل دیتا ہے۔ یہ فعل کا نظر نہ آنے والا پس منظر ہے، جو بالآخر اس کو متعین کرتا ہے۔ ایک فعل وقتی (Temporal) یا دینوی (Profane) ہوتا ہے۔ اگر اس کے پیچھے وہ پیچیدگی موجود ہو، اسلام میں وہی ایک حقیقت ہے، جسے اگر ایک رُخ سے دیکھا جائے، تو کلیسا ہے اور اگر دوسرے رُخ سے دیکھا جائے تو ریاست ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ کلیسا اور ریاست ایک شے کے دو پہلو یا اجزا ہیں۔ اسلام ایک واحد حقیقت ہے جو تقسیم نہیں کی جاسکتی ہے۔" (6)

بہرحال اسلام کے نظریہ حیات کو جامع اور عملی نہ سمجھنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بنی کہ اسلام کے نظریات کو دین و دنیا کی ابحاث میں تقسیم کیا گیا اور اسلامی اصولوں کو جو انسان اور معاشرہ کی فلاح اور رہنمائی کے لئے صراط مستقیم کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ثنویت کا درجہ دے کر انسانیت کو ترکِ دنیا کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ایک انسانی گروہ کو یہ باور کرایا گیا کہ کامیابی کا راز فقط دنیا ہے۔ اسلام میں ترکِ دنیا کرنے اور اہل دنیا بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے۔ " لا رھبانیۃ فی الدین۔ " دین میں رہبانیت نہیں ہے۔ (7)

ایک طرف اسلام انسان کو اخروی زندگی میں کامیابی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے تو دوسری طرف ان کا تعلق انسان کی دنیاوی زندگی سے بھی ہے۔ اسلام انسان کی اخروی زندگی کے ساتھ دنیوی زندگی کی کامیابی کا بھی متمنی ہے۔ دنیاوی زندگی میں جب انسان الہ کی الھیت کو تسلیم کرتا ہے تو اس کے ساتھ اسے اللہ کی حاکمیت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ کیونکہ انسان خود اپنے وضع کردہ قانون (Self legislation) کو غلطیوں سے مبرا رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اگر وہ اپنے دنیاوی تقاضوں کے مطابق قوانین بنا بھی لے تو اس کو غلطیوں سے پاک کرنے کے لئے الٰہی ہدایات کا محتاج رہنا پڑے گا۔ انسان کی اپنی فطری آزادی میں کچھ الٰہی قیود و شرائط لگانا خود اس کے اپنے مفاد میں ہے۔ لہٰذا یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ انسان ایک

صالح اور نیک معاشرہ قائم کرنے کے لئے Divine Laws کا محتاج ہے اور انہی الٰہی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک کامیاب انفرادی و اجتماعی زندگی ممکن ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قوانین الٰہی کا نفاذ حکومت اور ریاست کے بغیر ممکن ہے؟ یہ بات بالکل واضح ہے کہ وعظ و نصیحت کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ممکن نہیں، بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ انبیاء کی اصل ذمہ داری یہی تھی کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں تب ہی تو اللہ نے انبیاء کو حکومت اور طاقت حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ سورہ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

''وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِینَ اٰمَنُوا مِنْکُم وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِم وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوفِھِم اَمناً'' (8)

ترجمہ: '' تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوطی کے ساتھ محکم کرکے جمادے گا جیسے ان کے لئے وہ پسند فرما چکا ہے اور ان کے اس خوف وخطر کو وہ امن وامان سے بدل دے گا۔''

قطع نظر اس بات سے کہ اس آیت کے اصل مصداق کون لوگ ہیں یہ بات واضح ہو جاتی ہیں کہ اہل ایمان اور صالح لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے زمین پر حکمرانی، دینی اقتدار اور امن و سکون کا وعدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے اقامت دین، نفاذ شریعت اور حدود اللہ کے اجراء کے لئے حکومت چاہی ہے۔ متعدد انبیاء کی حکومتوں کی طرف اجمالی اشارے اور قرائن خود قرآن مجید بھی موجود ہیں۔ سب سے واضح اور اہم دلیل خود ریاست مدینہ کی ہے جو میثاق مدینہ کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ جس میں آپ ﷺ کی بالادستی کو میثاق مدینہ میں شامل تمام قبائل نے قبول کیا تھا۔ ڈاکٹر زاہد علی زاہدی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھتے ہیں: ''مدینہ میں قائم ہونے والی ریاست کے سربراہ خود رسول اکرم ﷺ تھے اور اس طرح روحانی قیادت اور سیاسی قیادت دونوں ایک شخصیت میں جمع ہو گئی تھی۔'' (9)

لہٰذا انسان کو یقیناً اللہ کی زمین میں اللہ کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے ایک الٰہی حکومت کا قیام لازم ہے اور ان مقاصد کا حصول ریاست کے بغیر ممکن نہیں۔ مسلمان کے لئے خود ریاست اور حکومت کا حصول اصل مقصد نہیں ہے ،بلکہ الٰہی قوانین کی تنفیذ کے لئے ریاست اور حکومت کا ہونا لازم ہے۔ اب ہم گفتگو کرتے ہیں کہ اس ریاست کے خدوخال کیسے ہونا چاہئیں جس کو ایک اسلامی ریاست کہا جاسکے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلامی ریاست کس کو کہا جائے۔ کیا جس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، اسے اسلامی ریاست کہا جانا چاہئے خواہ اس ملک میں قوانین ملکیہ کچھ بھی ہوں؟ یعنی آبادی کو بنیاد بناتے ہوئے ریاست کو اسلامی قرار دیا جائے۔ یا اس ملک کو اسلامی ریاست کہا جائے کہ جس کی آبادی کی اکثریت بھی مسلمانوں کی ہو اور سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں کے پاس ہو؟ یہ دیکھے بغیر کہ اس سیاسی اقتدار کا دائرہ کار کیا ہے، دین کا ریاستی امور میں کتنا عمل دخل ہے؛ صرف اس بناء پر کہ زمام حکومت مسلمانوں کے پاس ہے کیا اس ملک کو اسلامی ریاست کہا جائے گا؟

آج کی دنیا میں جس مملکت کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہو، اسے اسلامی ریاست سمجھا جاتا ہے۔ ہماری نظر میں اسلامی ریاست کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جس مملکت کے قوانین سلطانیہ (ملکی قوانین) اسلامی اصولوں کے بنیاد پر بنائے گئے ہوں، یعنی قرآن وسنت کو ان قوانین میں مرکزیت حاصل ہو اور حاکمِ ریاست

خود اپنی رعایا کے برابر ان قوانین کا پابند بھی ہو۔ اب اگر کسی ملک میں اکثر آبادی مسلمانوں کی ہو، لیکن اس ریاست کے قوانین ملکیہ کی بنیاد اسلام کے بجائے سیکولرازم، سوشلزم یا کسی اور نظریہ کی بنیاد پر ہو، تو اس ملک کو اسلامی ریاست نہیں کہا جاسکتا۔

آج دنیا میں 53 سے زیادہ ممالک ہیں، جہاں کی اکثر آبادی مسلمانوں کی ہے، کیا ان تمام ممالک کو اسلامی ریاستیں کہا جاسکتا ہے؟ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت سارے ایسے ممالک ہیں، جہاں قوانین سلطنت، سوشلزم اور سیکولرازم وغیرہ کے اصولوں پر موجود ہیں، ترکی اور مقدونیہ جیسے ممالک کی مثالیں ہمارے دور میں موجود ہیں۔ درحالانکہ وہاں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے اور زمام حکومت بھی بظاہر مسلم حکمرانوں کے پاس ہے۔

اس بات کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ اسلامی ریاست اس کو کہا جائے جس کے قوانین ملکیہ قرآن وحدیث کے بنیاد پر وضع کئے گئے ہو اور ریاست انسان کے انفرادی اور اجتماعی امور میں ہدایت فراہم کرتی ہو۔ لیکن بدقسمتی سے بیسوی صدی کے بعد بعض مسلمان دانشوروں نے بھی اس نظریہ کی حمایت کی کہ ریاست میں دین کا عمل دخل نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حکومتی سطح کے معاملات مذہبی وابستگی سے بالاتر رہ کر طے کئے جانے چاہئیں۔

یاد رہے کہ ریاست کی جتنی بھی توجیہات اور تعریفیں کی گئی ہیں جس کے مطابق ریاست کے تین یا چار عناصر ہیں، جن میں سب سے اہم عنصر حکومت ہے، چنانچہ بعض ماہرین نے حکومت ہی کو ریاست کہا ہے۔ پس جس ریاست کے قوانین قرآن وحدیث کی بنیاد پر بنائے گئے ہو اور حکومت اور ریاست کے تمام امور مذہب کے تابع ہوں تو ایسی ریاست کو اسلامی ریاست کہا جائے گا۔ بہرحال حکومت اسلامی کے وجود کے بغیر اسلامی ریاست کا تصور بھی ممکن نہیں۔ دنیا میں جتنی بھی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوئی ہیں ان کی بنیادیں ہمیشہ کمزور اور مضمحل رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر حکومتیں سیکولر بنیادوں پر قائم ہوئیں تو کچھ موروثی بنیادوں پر، بعض دفعہ اسلامی ریاست کے قیام کی بھی کوششیں نظر آتی ہیں، جن کی بنیاد شورائیت اور اجماع پر رکھی گئی تھی، لیکن یہ بھی بہت جلد اپنی ہیئت اور حقیقت کو قائم نہ رکھ سکیں اور یہ حکومتیں بادشاہت کا روپ اختیار کر گئیں۔

جمہوریت کو بنیاد بناتے ہوئے بھی اسلامی ریاستوں کو قائم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن اس نے بھی مسائل پیدا کئے۔ اس لئے جو لوگ اسلام کی بنیادوں پر ریاست کا قیام چاہتے تھے انہوں نے جمہوریت کے (مغربی) تصور کو اسلام کے لئے خطرناک قرار دیا۔ معروف مستشرق Karen Armstrong (کیرن آرم سٹرانگ) نے ایک کتاب Islam: A Short History لکھی۔ جس کا اردو ترجمہ "مسلمانوں کا سیاسی عروج وزوال" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کے آخری باب میں مسلمانوں کے ہاتھوں جمہوریت، اجماعیت، بادشاہت، شورائیت اور عقلانیت (سیکولرازم) کے نظریات پر قائم حکومتوں کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کی ہے۔ ان نظریات کی خامیوں اور نقصانات کے تاریخی حوالے بھی پیش کئے ہیں۔

بہرحال مسلمانوں کی ہمیشہ سے یہ کوششیں رہی ہیں کہ ایک ایسی سیاسی جمہوری ریاست قائم ہو، جس میں اسلام کے آفاقی اصولوں کا اجراء ہو اور تمام تر ریاستی امور دین کے بتائے ہوئے اصولوں کے پابند ہوں۔ ماضی میں قائم ہونے والی بعض حکومتوں نے اسلامی اصولوں کا اجراء کرنے کی بھی کوششیں کیں لیکن ان کوششوں کے باوجود ایک مکمل اسلامی فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کرنے میں مسلمان ناکام رہے۔ ہماری نظر میں اس ناکامی کی اصل وجہ وہ نظریات تھے، جس کو بنیاد بنا کر وہ حکومتیں اور ریاستیں قائم کی گئی تھیں۔ یہ نظریات اسلامی نظریہ حیات سے مکمل مطابقت اور موافقت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے یہاں پر ہم ان نظریات کا مختصر جائزہ پیش کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ اسلام کا نظریہ طرز حکومت کیا اور کیسا ہے؟

بادشاہت :

بادشاہت کو ملوکیت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا میں رائج شدہ طرز حکومتوں میں ایک بادشاہت ہے۔ جس کی ابتدا اسلام میں رحلت نبوی کے فوراً بعد سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ بقول مولانا مودودی امیر شام کے جبری تخت نشین ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ بادشاہت یا اس جیسے تمام تر موروثی حکومتوں کو اسلامی طرز حکومت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی جتنی حکومتیں قائم رہی ہیں یا اس وقت ہیں، ان کو الٰہی اور اسلامی حکومتیں کہنا دین کو جامع اور کامل ماننے والے محققین کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اگر کچھ مخصوص افراد حکومت کرنے کو اپنا موروثی حق سمجھتے ہوں، چاہے ریاست میں (ایک محدود پیمانے پر) حدود شریعۃ کا اجراء کیاجا تا ہو تو کیا اس کو بنیاد بناتے ہوئے اس حکومت کو اسلامی حکومت تصور کیا جائے گا؟ بعض بادشاہتوں نے رعایا کو وقتی طور پر مطمئن کرنے کے لئے بعض مذہبی اصولوں کو ملک میں نافذ کیا۔ لیکن دوسری طرف خود کو موروثی طور پر ریاست کا حاکم قرار دیا۔ جبکہ اسلام میں موروثی طور پر حاکمیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ ایسی حکومتوں کو نہ تو اسلامی تائید حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی حکومت میں عوام کی رائے کا عمل دخل ہوتا ہے۔ موروثی حق حکومت حاصل کرنے والے حکمرانوں نے ہمیشہ سیکولرازم کی تقلید کرتے ہوئے عوام اور رعایا کو یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ریاست کے امور میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ڈاکٹر عسکری کہتے ہیں۔

" شہنشاہت پرست مفکرین جو سیاست میں مذہب کی مداخلت کے خلاف تھے انہوں نے کچھ موہوم سے نظریات پیش کرنا شروع کر دیے مثلاً یہ کہ اقتصادیات، قانون، تعلیم اور یہاں تک کہ اخلاقیات اور ثقافت بھی مذہب سے بالکل علیحدہ ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ مذہب کو اس کی حقیقی شکل میں انسانی زندگی کے انتظامی عنصر سے قطعاً خلط ملط نہیں کرنا چاہیے تاکہ مذہب اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھ سکے۔" (10)

بادشاہت نے ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کی سیکولر کوششیں اس لیے کیں کہ بادشاہت کے لاقانونی اقدام کی راہ میں صرف اسلامی نظریات رکاوٹ تھے اگر ریاست کی سیاست مذہب کی تابع ہو تو رعایا مذہب کے اصولوں کے مطابق بادشاہت کے طرز حکومت کو قبول نہیں کرے گی، کیونکہ اسلام کسی کو موروثی حق حکومت نہیں دیتا۔ اسلام میں بادشاہت کو حق حکومت نہ دینے کی ایک وجہ بادشاہوں کا ریاست میں مطلق العنان ہو کر حکومت کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں کے اکثر فیصلے عوامی مفاد عامہ کے لئے نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ذاتی نوعیت کے فیصلے ہوتے ہیں، کیونکہ بادشاہ ایک ایسا مطلق العنّان حاکم ہوتا ہے جو کسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ تصور نہیں کرتا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں :

Muslim King: The gaze of Muslim Kings was solely fixed on their own dynasic interests and so long as these were prorected, they did not hesitate to sell their countries to the highest bidder](11)

بہر حال یہ بات طے ہے کہ اسلام میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس ریاست میں بادشاہی طرز حکومت ہو وہ ریاست قطعی طور پر ایک فلاحی اور اسلامی ریاست نہیں کہلائی گی۔

جمہوریت:

دنیا کی تمام طرح کی طرز حکومتوں میں سے معروف اور مشہور طرز حکومت۔" جمہوریت" ہے۔ جمہوریت جس کو انگریزی میں Democracy کہا جاتا ہے یہ دراصل یونانی لفظ ہے جو دو الفاظ Demo اور Cracy کا مرکب ہے۔ Demo کے معنی عوام اور Cracy کے معنی حکومت کے ہیں۔ جمہوریت کا کوئی ایک یقینی معنی و مفہوم نہیں ہے۔ معروف ماہر لغت لویس معلوف نے جمہوریت کی یوں تعریف کی ہے:

[الجمهوريَّة] الامة او الدولة يعيّن زعيمها لوقت محدّد لا بالتَّوارثِ بل بانتخاب جمهور الامة (12)

جمہوریت: دراصل رعایا یا ریاست جو اپنے سربراہ کو مخصوص مدت کے لئے اپنا سربراہ متعین کرے اور یہ تعیناتی وراثت کے بنیاد پر نہیں ہو بلکہ ملک کی عوام یہ انتخاب اپنی رائے کے ذریعے کرے۔

دنیا کے سینکڑوں ممالک میں جمہوری حکومتیں موجود ہیں، لیکن سب مختلف النوع جمہوریتیں ہیں۔ جمہوریت ایک مثبت معنی رکھتی ہے، اس لئے مختلف النوع طرز حکومت رکھنے کے باوجود ہر ایک نے اپنے کو جمہوریت کا دعویدار قرار دیا ہے۔ مولانا مودودی جمہوریت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ مغربی طرز کی لادینی جمہوریت Secular Democracy نہیں ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے جمہوریت تو نام ہی اس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت اعلیٰ حاصل ہو۔ ان ہی کی رائے سے قوانین بنے اور صرف انہی ہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو۔ جس قانون کو وہ چاہیں نافذ ہو اور جسے وہ نہ چاہیں وہ کتاب آئین میں سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے۔ یہاں ایک بالاترین قانون خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے دیتا ہے، جس کی اطاعت ریاست اور قوم کو کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام "الٰہی حکومت" ہے جس کو انگریزی میں Theocracy کہتے ہیں۔" (13)

جمہوریت کا عمومی مفہوم عوامی حکومت ہے۔ اس لحاظ سے جمہوریت وہ واحد راستہ ہے جس میں ریاست کے اکثر عوام اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بہترین اور صحیح امور کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اکثریت کا ایک صحیح انتخاب ممکن ہے، لیکن اس کے باوجود جمہوریت یا اکثریت کی رائے کو حتمی طور پر صحیح اور غلط کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ ممکنات سے خالی نہیں کہ لوگوں کی منتخب شدہ جماعت عملی طور پر انسان کی فلاح و بہبود کے خلاف کام کریں، جس کی مثالیں دور حاضر کی جمہوری حکومتوں یا تاریخ کی تمام جمہوری حکومتوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں!

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے (14)

بہر حال یہ ماننا ضروری ہے کہ جمہوریت کا جو معنی و مفہوم عرف عام میں سمجھا جاتا ہے، اس جمہوریت کو دینی اور الٰہی حکومت قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت کا ایک مغربی طرز فکر ہے اور ایک اسلامی طرز فکر۔ متعدد مفکرین نے جمہوریت کی ان دونوں اقسام کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کرن آرم اسٹرانگ نے مغربی جمہوریت کی تعریف یوں کی ہے:

''عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لئے'' (15)

اسلامی جمہوری طرز حکومت اور مغربی جمہوری طرز حکومت میں بہت فرق ہے۔ مغربی جمہوریت کے مقابلے میں اسلامی جمہوری حکومت کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں ''خدا کی حکومت، خدا کے ذریعے، عوام کے لئے'' اور اسی صورت میں جمہوریت کی موافقت اسلامی حکومت سے ممکن ہے۔ لیکن اگر جمہوریت کا وہ مفہوم جس میں مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن و سنت پر نہیں اور طرز حکومت وہ نہیں جو اسلام تقاضا کرتا ہے تو پھر ایسی مملکت اور اس کی حکومت کو الٰہی یا دینی حکومت صرف اس بنیاد پر قرار دینا کہ زمام حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، صحیح نہیں ہے۔ حضرت روح اللہ خمینیؒ نے بادشاہ ایران کی دو ہزار سالہ پرانی بادشاہت کا خاتمہ اسی لئے کیا تھا کہ بادشاہ ایران عملی طور پر اسلامی قوانین کی روح کا خاتمہ کر چکا تھا اور نام نہاد لبرل جمہوریت کے نام سے حکومت کر رہا تھا۔امام خمینیؒ کا اصل ہدف بادشاہت کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ نام نہاد لبرل جمہوریت کا خاتمہ کرنا تھا جو اسلامی قوانین کی تنفیذ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی اور اس کے بدلے میں ایک اسلامی جمہوریت کا قیام تھا۔امام خمینیؒ نے مدرسہ فیضیہ میں انقلاب اسلامی کے قیام کے بعد اپنی ایک تقریر میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی تھی:

''میں نے شروع ہی سے پکارا کہ ہم ان دو لفظوں کو چاہتے ہیں یعنی ''اسلامی جمہوریت'' اگر آپ دیکھ لیں کہ اسلام کا لفظ چھوڑا گیا اور صرف جمہوری کہا تو جان لیجئے کہ ان کا راستہ آپ کے راستے سے الگ ہے۔ اگر آپ دیکھ لیں کہ اس میں ایک بھی لفظ کا اضافہ ہوا تو جان لیجئے کہ یہ دھوکہ ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کو اسلام کے خلاف راستے پر لے چلیں۔ اگرچہ وہ شہنشاہی حکومت کے خلاف بھی ہوں، بلکہ ان میں بہت سارے برخلاف بھی ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ شہنشاہی حکومت ختم ہو جائے اور بس۔ وہ تو صرف ابتدائی مرحلہ تھا۔ چونکہ وہ حکومت اس بات میں رکاوٹ ڈالتی تھی کہ اسلامی احکام نافذ ہوں اور قرآن پر عمل پیرا ہو جائے۔ اس لیے ہم نے اس کی مخالفت کی۔۔۔۔ہمارا دشمن صرف بھاگا ہوا شاہ نہیں تھا بلکہ جس کسی کا راستہ اسلام کا راستہ نہ ہوگا وہ ہمارا دشمن ہے چاہے وہ کسی بھی نام سے پکارا جاتا ہو۔ جو کوئی جمہوریت چاہتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کا دشمن ہے۔ جو بھی کوئی ڈیموکریٹک جمہوریت کا نعرہ بلند کرے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کو نہیں چاہتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیا ان لوگوں نے شہادت کو ڈیموکریسی یا دائیں بازو کے راستے کے لئے سعادت سمجھا، یا اسلامی جمہوریت کے لئے؟ کیا ہمارے نوجوانوں نے اپنا خون اس لیے بہایا کہ وہ اس طرح کی جمہوریت قائم کریں جس طرح کی روس یا امریکہ میں ہے؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ ہم سب نے یہ سب کچھ کیا، صرف جمہوریت کے لئے۔'' (16)

حضرت امام خمینیؒ نے واشگاف الفاظ میں یہ واضح کیا کہ ان کی جدوجہد کا واحد مقصد اسلامی جمہوری حکومت کا قیام تھا، جس میں خدا کا قانون، خدا کے تائید کردہ بندوں کے ذریعے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نافذ ہو اور اسی کو وہ اسلامی جمہوری حکومت کہتے ہیں، جس کے لیے دینی اور الٰہی حکومت کی اصطلاحیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔امام خمینیؒ کی اس الٰہی فکر کو ''ولایۃ الفقیہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔

جمہوریت اور الٰہی حکومت میں اس لئے بھی بہت زیادہ فرق ہے کہ موجودہ جمہوریت جس معنی اور اور مفہوم میں سمجھی جاتی ہے وہ دراصل لبرالزم کا دوسرا نام ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ دور حاضر میں بھی مغربی ممالک مسلمانوں کو اپنے ملکوں میں جمہوری حکومتوں کے قیام پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ استعمار یہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت کے لبادہ میں اس کی اپنی منشاء کے مطابق لبرالزم نظریات موجود ہیں۔ امریکی صدر بش نے جب مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا تو انہوں نے اپنے اس دورے کے دوران مصر کے شہر حرم الشیخ میں پاکستانی ہم منصب سید یوسف رضا گیلانی کے ساتھ ایک پریس بریفنگ سے

خطاب کیا، جس میں انہوں نے مسلمان کو اپنے ممالک میں جمہوریت لانے پر زور دیا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدر بش مسلمانوں کو کونسی جمہوریت قائم کرنے کو کہہ رہے ہیں؟صدر بش تو عوامی رائے پر قائم ہونے والی جمہورتوں کا صرف اس لئے انکار کرتے ہیں کہ یہ حکومتیں امریکہ نواز نہیں ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ مسلمان ممالک میں اسلامی طرز فکر کی جمہوری حکومتیں قائم کرنے کا حامی ہو۔اس حوالے سے فلسطین کے گزشتہ انتخابات ہمارے پیش نظر ہیں۔ حضرت امام خمینیؒ نے اسی لئے تو فرمایا تھا کہ ''جو کوئی جمہوریت چاہتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کا دشمن ہے۔جو بھی کوئی ڈیموکریٹک جمہوریت کا نعرہ بلند کرے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کو نہیں چاہتا'' (17) امام خمینی نے مغربی جمہوریت کی بڑی شدّت کے ساتھ مخالفت اسی لئے کی تھی کہ مغربی جمہوریت لبرالزم کا دوسرا نام ہے۔ جبکہ اسلامی نظریہ حیات میں انسان محکوم اور بندہ قرار پاتا ہے۔احمد واعظی نے اپنی کتاب ''اسلامی نظریہ حکومت'' (جس کا اردو ترجمہ معارف اسلامی پبلشرز، قم نے کیا ہے) میں جمہوری طرز حکومت پر تفصیلی جائزہ لیا ہے، جس میں جمہوریت اور دینی حکومت میں موافقت اور عدم موافقت پر بحث کی ہے۔ زیادہ تفصیل کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

جمہوری طرز فکر کے مطابق اگر کسی ریاست میں حکومت قائم ہوتی ہے تو وہ صرف عوام کی رائے کے مطابق قائم ہوگی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کو یا عوام کے منتخب نمائندوں کو کس حد تک حق حکومت حاصل ہے؟ کیا عوام کے منتخب نمائندوں کو حاکمیت حاصل ہے؟ مولانا مودودی نے اپنی کتاب میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔آپ سوالیہ انداز میں اس کا جواب یوں دیتے ہیں؛

Political Sovereignty کس کے پاس ہے؟اس کا لامحالہ جواب یہی ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہے۔ پھر کسی خاص طبقہ کا نہیں بلکہ عوام کے پاس ہے اس فرق کے ساتھ کہ مغربی جمہوریت میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹہرتے ہیں۔ (18)

شورائیت:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلافت کا تعین کس طرح سے ہوگا، کیا خلافت کا تعین شوریٰ اور اجماع کے ذریعے صحیح ہے؟ اگر خلافت کا تعین شوریٰ اور اجماع سے قائم کیا جائے تو یہ بھی دراصل عوامی انتخاب ہوگا تو اس صورت میں حاکمیت اعلیٰ کا حق عوام کو حاصل ہوگا اس صورت میں لبرل جمہوریت اور اس جمہوریت میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جمہوریت چاہے اجماع، شوریٰ یا کوئی اور طریقہ سے قائم ہو اسلامی نظریہ حاکمیت کے عین مطابق نہیں ہے کیونکہ اس سے جمہور ہی کو حاکمیت حاصل ہوجاتی ہے، جبکہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق حاکمیت اعلیٰ کا حق صرف خالق کائنات کو حاصل ہے۔ اس کے بعد اللہ کے نمائندے انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے اور پھر رسول کے تعین کردہ نمائندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود حاکمیت اعلیٰ کا حق اپنے پاس رکھیں یا اپنے نمائندوں کو یہ حق تفویض کریں۔ یوں حاکمیت اعلیٰ کا انتخاب خود خالق کی طرف سے ہونا ممکن ہے۔ عوام اللہ کی قائم کردہ حاکمیت اعلیٰ کے زیر تسلط اپنی جمہوری روش کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں میں منافع اور مصالح کے لئے عوامی نمائندوں کو منتخب کرسکتے ہیں، اگر جمہوریت کو اس معنی اور مفہوم میں لیا جائے تو اس جمہوریت کی گنجائش ممکن ہے۔ یاد رہے کہ اس جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں فرق صاف واضح ہوگا کہ جسے مولانا مودودی نے مغربی جمہوریت کی تشریح میں کہا ہے کہ مغربی جمہوریت

میں جمہور کو حاکمیت حاصل ہے، لیکن اسلامی جمہورت میں حاکمیت اللہ کو حاصل ہے تو اس کی اصل اور عملی شکل یہی ہو سکتی ہے۔ مولانا مودودی ایک اور جگہ اسی طریقہ کار کو قابل عمل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسلامی ریاست کیوں؟ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلق اس کی ہے لہٰذا فطرتاً امر کا حق Right of Rule بھی صرف اس کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک Dominion میں اس کی خلق پر خود اس کے سواء کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ صحیح راستہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اس کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت میں اس کے قانون شرعی کے مطابق حکمرانی ہو اور فیصلے کئے جائیں، (سورہ آل عمران کی ایت نمبر ۲۶ میں اس طرف اشارہ ہے) اس اصل الاصل کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے سلب کیا گیا، کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے۔ بندہ اور محکوم ہے اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہے۔ البتہ قانون الٰہی کی حدود کے اندر استنباط اور اجتہاد سے تفصیلی فقہ مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے۔ خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور عدالت صرف وہ ہے جو اس قانون کی بناء پر قائم ہو جو اس نے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے اس کا نام خلافت ہے۔ اس کے بر عکس ہر وہ حکومت اور عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں سلطان (Chater) عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کالعدم ہے۔'' (19)

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ لبرل جمہوریت کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے البتہ مقید جمہوریت کی گنجائش اسلام میں ہے اسی کو شیعہ ''نظریہ ولایت'' کہتے ہیں اور اس کی عملی شکل حکومت ایران ہے، جس میں عوامی رائے بھی شامل ہے، لیکن حاکمیت اعلیٰ کا انتخاب عوام کے پاس نہیں ہے۔ اس نظریہ کی تفصیل سمجھنے کے لیے احمد واعظی کی کتاب ''اسلامی نظریہ حکومت'' کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلمان اکثریت کے ساتھ یہی رائے رکھتے ہیں کہ خلیفہ کا انتخاب اور روش حکومت کی بنیاد شوریٰ پر قائم ہے۔ معروف مصری عالم ڈاکٹر یوسف قرضاوی شوریٰ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بلاشبہ اسلام نے شوریٰ کی مفصل شکل بیان نہیں کی، لیکن اس کا ذکر مکی قرآن میں ہے جو فرد اور معاشرے کے لئے اس کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ مکی قرآن نے شوریٰ کو اسلامی زندگی کے عناصر میں سے ایک عنصر بنادیا ہے اور قیام صلوٰۃ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے متعلق حکم کے ساتھ بیان کرکے اسے اسلامی معاشرے کی لازمی خصوصیت قرار دیا ہے۔'' (20)

یہ بات قطعی ہے کہ انسانی نظام زندگی میں شوریٰ کو اولیت حاصل ہے، لیکن خلیفہ کے انتخاب میں شوریٰ کا کوئی کردار اسلام میں نہیں ہے۔ قرآن مجید نے کہیں خلیفہ کے انتخاب کے اصول میں شوریٰ کو معیار نہیں قرار دیا، جن آیات میں شوریٰ کی اہمیت پیش کی جاتی ہیں ان آیات کا مصداق انتخاب خلیفہ نہیں ہے بلکہ معاملات زندگی ہے۔ سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۳۸ اور سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں معاملات میں مشورہ کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حاکم کا انتخاب شورائیت کے ذریعے سے ہونا لازم قرار دیا ہے، تو کچھ مفسرین نے ان آیات کے ذریعے حاکم کو راہ سمجھانے کا معیار شوریٰ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ میں خلیفہ کے انتخاب کے معیار کی ایک ہی مثال حضرت عمرؓ کی حیات میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ نے چھ اصحاب شوریٰ کو مقرر کرکے اکثریتی اصول کو اختیار فرمالیا تھا، یہاں تک کہ اگر تین ایک رائے اختیار کرلیں اور باقی تین دوسری جانب ہوجائیں تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ (آپ کا اپنا فرزند) جس رائے کے حامی ہوں اسے ترجیح حاصل ہوجائے اور اگر فریقین اس پر رضامند نہ ہوں تو ان تین کی رائے کو ترجیح دی جائے جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف موجود ہوں۔'' (21)

قطع نظر اس کے کہ اس شورائیت کا سیاق و سباق کیا ہے۔ لیکن اس میں حضرت عمرؓ کی طرف سے اپنے فرزند اور عبدالرحمٰن بن عوف کو حق انتخاب دینا خود یہ بتا رہا ہے کہ انتخاب خلیفہ کا معیار شورئیت نہیں ہے۔ کیونکہ اس فیصلے میں اصل مرجع حضرت عمرؓ قرار پاتے ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بھی اس موقع میں اپنی مرجعیت کے دلائل پیش کئے تھے۔ دیکھیں نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی اصل ماہیت یہ ہے کہ جس ملک کے قوانین کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہو اور زمام حکومت اللہ کے منتخب شدہ بندوں کے پاس ہو اور وہ ان قوانین کو مطلقاً ملک میں نافذ کرتے ہوں، یعنی خدا کے قوانین خدا کے ذریعے خدا کی مخلوق کے لئے۔ جس ملک کی اکثر آبادی مسلمانوں کے پاس ہو اور زمام حکومت بھی مسلمانوں کے پاس ہو، لیکن اس حکومت کی بنیاد جمہوریت، بادشاہت، شورائیت، یا کسی بھی طرز کی ہو تو اس ملک کو اسلامی ریاست نہیں کہا جائے گا۔ اسلامی ریاست صرف اس مملکت کو کہا جاسکتا ہے جس میں قائم حکومت مذہب کی تابع ہو اور حاکمیت اعلیٰ کا حق اللہ اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کو حاصل ہو جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

''تمہارے سرپرست اور رہبر صرف خدا، اس کا پیغمبر اور وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ انہوں نے نماز قائم کی ہے اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے''۔ (22)

اس ریاست کے معاملات اور فیصلوں میں عوامی شرکت بھی ہو، ریاست عوامی رائے کا احترام کرے، جیسا کہ پیغمبر خدا ﷺ کو حکم ہوا کہ ''اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو'' (23) جبکہ آپ ﷺ اللہ کی طرف سے مطلقاً حق ولایت رکھتے تھے، لیکن پھر بھی آپ ﷺ کو حکم ملا کہ ریاست کے امور میں عوام کی شرکت کے لیے اہتمام کیا جائے تاکہ عوام اپنے منافع اور مصالح کا انتخاب خود کرسکیں۔ اسی پس منظر میں کسی بھی ملک میں حکومت قائم ہو تو اس ملک کو اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۰۸

2۔ زاہدی، ڈاکٹر زاہد علی، حکومت اسلامی کا فکری تجزیہ بحوالہ ولایت فقیہ، پی ایچ ڈی مقالہ باب اول، ص ۷، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

3۔ واعظی، احمد، اسلامی نظریہ حکومت، معارف اسلام پبلشرز، سنہ اشاعت ۱۴۲۶ھ ق، ص ۵۲، قم، ایران

4۔ قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، اسلام اور سیکولرازم، مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، سن طباعت 1997ء، ص ۵۳، اسلام آباد

5۔ رضی، علامہ شریف، نہج البلاغہ، مترجم مولانا مفتی جعفر حسین، ناشر امامیہ کتب خانہ مغل پورہ، خطبہ نمبر ۱۶، لاہور

6۔ محمد، علامہ اقبال، مترجم شہزاد احمد، اسلامی فکر کی نئی تشکیل، مکتبہ خلیل یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ، ص ۱۸۵، ۱۸۴، اردو بازار، لاہور، پاکستان

7۔ امام ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوٰۃ الشریف، عبداللہ اکیڈمی، سن اشاعت ۲۰۰۳، حدیث نمبر ۳۱۶، لاہور

8۔ سورہ نور، آیت نمبر ۵۵

9۔ زاہدی، ڈاکٹر زاہد علی، حکومت اسلامی کا فکری تجزیہ بحوالہ ولایت فقیہ، پی ایچ ڈی مقالہ باب اول، ص ۱۲

10۔ حسین عسکری، پروفیسر ڈاکٹر مرزا، انقلابِ ایران کے اثرات، ص ۲۷۸،

11۔ جعفری، سید محمد حسین، اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، پاکستان اسٹڈی سنٹر، ص ۷۷، جامعہ کراچی

12۔ المنجد، للمطبعۃ الکاثولیکیّۃ، ۱۹۵۲ء، ص ۹۹، بیروت۔

13۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹیڈ، ص ۱۳۹، جون 1995، لوئر مال روڈ لاہور۔

14۔ محمد، علامہ اقبال، ضرب کلیم، الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار، جون 1991ء، ص ۱۲۶، لاہور

15۔ کرن آرمسٹرانگ، مسلمانوں کا سیاسی عروج وزوال، محمد احسن بٹ، ناشر نگارشات پبلشرز، 2005ء، ص ۱۷۶، مزنگ روڈ، لاہور

16۔ پروفیسر ڈاکٹر مرزا عسکری حسین، انقلابِ ایران کے اثرات، بحوالہ امام خمینی، انقلاب کی راہ عمل، اردو ترجمہ انتشارات کتاب خانہ اسلامی، ص ۱۸

17۔ پروفیسر ڈاکٹر مرزا عسکری حسین، انقلابِ ایران کے اثرات، بحوالہ امام خمینی، انقلاب کی راہ عمل، اردو ترجمہ انتشارات کتاب خانہ اسلامی، ص ۱۸

18۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، ص ۳۴۲،

19۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، ص ۵۲۔۶۰،

20۔ قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، اسلام اور سیکولرازم، مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، سن طباعت 1997ء، ص ۱۴۰، اسلام آباد

21۔ قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، اسلام اور سیکولرازم، مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، سن طباعت 1997ء، ص ۱۴۲-۱۴۱، اسلام آباد

22۔ سورہ مائدہ، آیت نمبر ۵۵

23۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۵۸